جناب مظہر الدین صدیقی

توحیدی مذاہب میں عقیدۂ توحید

دنیا میں آج تک کوئی قوم ایسی نہیں گذری جس کی اجتماعی اور معاشرتی زندگی عقیدہ کی گرمجوشی سے خالی ہو۔ تاریخ پر ایک عمومی نگاہ ڈالنے سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ اجتماعی زندگی کے لئے عقیدہ کا وجود ضروری ہے۔ ایک مشترک عقیدہ ہی وہ رشتہ ہے جو ایک قوم یا جماعت کے افراد کو باہمی مودّت اور اخوت کے رشتوں میں منسلک کرتا ہے، بلکہ تاریخ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جس قوم میں عقیدہ کی جتنی زیادہ پختگی اور استواری پائی جاتی ہے اتنی ہی زیادہ وہ قوم باعمل، ترقی پذیر اور فتحمند و غالب رہتی ہے بشرطیکہ اس کا عقیدہ حقیقت کے کسی اعلیٰ تصوّر پر مبنی ہو۔

توحیدی مذاہب کے عقائد نہ صرف اس لحاظ سے قابل ترجیح ہیں کہ وہ وسیع تر انسانیت کے تصوّر پر مبنی ہیں۔ بلکہ اس اعتبار سے بھی وہ دیگر عقائد کی بہ نسبت بہتر ہیں کہ اُن کے تحت مسائلِ حیات کو جغرافی۔ نسلی یا قومی حدبندیوں کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ انسان کی عالمگیر فطرت کے نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ توحیدی مذاہب میں اسلام کو کیا امتیاز حاصل ہے اور کس لحاظ سے وہ ان تمام مذاہب پر فضیلت رکھتا ہے۔ اس کے لئے ہمیں دیگر توحیدی مذاہب اور اسلام کے تصوّر کائنات کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ تاکہ یہ معلوم کیا جاسکے کہ اسلامی تصوّر کائنات اور دیگر مذاہب کے تصوّرات میں کیا چیز ما بہ الامتیاز ہے۔

یہودی عقیدہ۔ یہودیت قدیم ترین توحیدی مذاہب میں سے ہے۔ اور اُس نے تاریخ مذہب پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ یہودی مذہب اس لحاظ سے اپنے زمانے کے دیگر مذاہب کی بہ نسبت زیادہ ترقی یافتہ تھا کہ اس نے عقیدۂ توحید کے ذریعہ قدیم اقوام کے اس عقیدہ کی تردید کی کہ ہماری کائنات پر متعدد قوتوں کی فرماں روائی ہے۔ جن میں سے ہر ایک اپنے دائرہ میں کامل طور پر آزاد اور خود مختار ہے۔ یہ تصوّر تعدّد الٰہ (POLYTHEISM) کے عقیدہ سے پیدا ہوا تھا جس میں یہودیوں کی ہم عصر قومیں مبتلا تھیں۔ بجز ایرانیوں کے جنھوں نے کائنات کی فرمانروا قوتوں کی تعداد کو گھٹا کر صرف دو قوتوں کا وجود تسلیم کیا۔ یعنی یزدان و اہرمن، جن میں سے اول الذکر قوت خیر اور ثانی الذکر قوت شر تھی۔ دوسری تمام اقوام جو یہودیوں کے گرد و پیش بستی تھیں دو سے زائد قوتوں کو کائنات پر فرمانروا اور حاکم مانتی تھیں۔ مصر، یونان اور بابل میں ہر مظہر فطرت کو ایک مستقل دیوتا تسلیم کیا جاتا تھا۔ جس کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ اُن قوموں کی داخلی زندگی میں کوئی وحدت باقی نہیں رہی تھی۔ کیونکہ جب تک ذہنی حیثیت سے

کائنات کا بصورت واحد ادراک نہ کیا جائے۔ اس وقت تک عملی زندگی میں وحدت کا قیام غیر ممکن ہے۔ اتنے کثیر تعداد خداؤں کو ماننے کی وجہ سے انسان فطرت کے مقابلہ میں اپنے آپ کو عاجز اور بے بس سمجھنے لگا تھا۔ اس پر فطری مظاہر کی ایسی ہیبت چھائی ہوئی تھی کہ وہ اپنی عقل و فکر کے استعمال سے خوف کھاتا تھا۔ اور ان ہیبت ناک قوتوں کی ہلاکت انگیزی سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لئے طرح طرح کے توہم پرستانہ افعال کا ارتکاب کرتا تھا۔ انسانی قربانیاں، نذر و نیاز کے مختلف طریقے، جادو، منتر اور دیگر بے حقیقت مذہبی رسوم اسی جذبۂ خوف کی پیداوار تھے۔

فطرت کی ہر قوت کو خدا ماننے کی وجہ سے اس میں یہ حوصلہ نہیں پیدا ہو سکتا تھا کہ وہ ان قوتوں کی تسخیر کرے۔ اور فطری حوادث کا مقابلہ کر کے اپنے آزاد اختیار و ارادہ سے زندگی کی تشکیل کر سکے۔ علاوہ ازیں تعدد آلہ ( ) کے عقیدہ کے باعث اس کے لئے یہ بھی ناممکن ہو گیا کہ وہ اجتماعی زندگی کا کوئی اُصولی قانون یا ضابطہ وضع کر سکے۔ کیونکہ قانون کا تصور بھی وحدانیت کے تصوّر سے ماخوذ ہے۔ جہاں زندگی کو مختلف خانوں میں اس طرح بانٹ دیا گیا ہو کہ ہر خانہ دوسرے سے بالکل جُدا اور ایک مستقل حیثیت رکھتا ہو۔ وہاں حیاتِ اجتماعی کو ایک واحد قانون کے ماتحت لانا دشوار ہو جاتا ہے۔ یہودی مذہب نے عقیدۂ توحید پیش کر کے ترقی کا ایک زبردست قدم اُٹھایا یعنی اوّلاً کائنات کا بصورت واحد ادراک کیا۔ اور ہر جُداگانہ اور خود مختار فطری قوت کی نفی کر کے عالم پر صرف ایک قوّت کی فرمانروائی تسلیم کی۔ اس طرح اس نے مظاہر پرستی اور شرک کا زور توڑ دیا۔ اور انسان میں عزّتِ نفس کا احساس پیدا کیا۔ جس کی وجہ سے اس کے اندر قوائے فطرت سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ دوسرے یہودی مذہب نے انسان کو احترامِ قانون کی تعلیم دی اور سب سے پہلے اس کے اندر یہ تخیّل پیدا کیا کہ اجتماعی فلاح و بہبود قانونِ الٰہی کی اطاعت و فرمانبرداری کا اور اجتماعی زوال و شکست اس کی نافرمانی کا نتیجہ ہے۔

اسی طرح یہودی مذہب نے انسان کو اس حقیقت سے روشناس کیا کہ فطرت اور کائنات اندھی بہری قوتوں کا مجموعہ نہیں۔ بلکہ اُصول و قانون کی پابند ہے۔ انسانی تاریخ میں انبیائے بنی اسرائیل کا یہ کارنامہ ہمیشہ یاد رہے گا کہ انھوں نے اعمالِ انسانی کے معاشرتی اور سیاسی نتائج کی اہمیّت واضح کی۔ اور ان عوامل کی طرف انسان کو توجہ دلائی جن پر اس کی اجتماعی تقدیر کا دارومدار ہے۔ یہودیوں میں آخرت کا تصوّر اتنا زیادہ گہرا اور نمایاں نہیں تھا جتنا حضرت عیسٰیؑ کی تعلیم میں۔ وہ جزا و سزا کے قانون کو بالعموم اسی دُنیا سے متعلق سمجھتے تھے۔ اور اعمالِ انسانی کے نتائج کو اپنی قومی زندگی کے آئینہ میں دیکھنے کے عادی تھے۔ انبیائے بنی اسرائیل میں سب سے پہلے دانیال نبی نے عقیدۂ آخرت پر زور دیا اور یہودیوں کو یہ تعلیم دینی شروع کی کہ انسان کی نیکی اور بدی کا فیصلہ صرف نتائج دنیوی پر موقوف نہیں ہے لیکن یہودیوں کی عملی پر اس عقیدہ کا مجموعی حیثیت سے بہت کم اثر ہوا۔ بنی اسرائیل کے پیغمبروں کا بڑا کارنامہ یہ تھا جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ انھوں نے اجتماعِ انسانی کو ضابطہ شناسی اور پیروی قانون کی تعلیم دی اور بے بنیاد

توہمات اور مظاہر فطرت کی پرستش سے آزاد کیا جس کے باعث بالآخر نوعِ انسانی میں یہ عزم و حوصلہ پیدا ہوا کہ وہ قوائے فطرت کا مقابلہ کر کے انھیں اپنے اغراض و مقاصد کا خادم بنالے۔ ان تمام باتوں کے باوجود یہودیوں کا عقیدۂ توحید کئی حیثیتوں سے ناقص اور تمدنی ترقی کی آیندہ منزلوں کے لئے ناکافی تھا۔ اولاً یہودیوں کا خدا ایک نسلی خدا تھا۔ جس نے صرف بنی اسرائیل کی رہنمائی اور فلاح کی غرض سے رسولوں کو مبعوث کیا۔ یہ تصوّر کہ کل انسانیت ایک واحد جسم کی مانند ہے اور تمام انسانوں کا باہمی تعلق برادرانہ اور مساویانہ ہے۔ یہودیوں کے ذہن و دماغ کو کبھی اپیل نہ کر سکا۔ انھیں ابتدا سے یہ تعلیم دی گئی تھی کہ وہ دیگر عبرانی قبیلوں مثلاً عمالقہ، عمانیوں (AMMONITES) اور موآبیوں (MOABITES) نیز پڑوس کی ارمنی فنیقی اور مصری اقوام سے میل جول نہ پیدا کریں۔ اور نہ ان کے مذہبی اور معاشرتی مراسم میں شرکت کریں بلکہ سب سے الگ تھلگ رہ کر زندگی بسر کریں۔ اس زمانے کے حالات میں جبکہ شرک، بُت پرستی اور مظاہر پرستی ہر ملک اور ہر قوم پر شدّت سے چھائی ہوئی تھی۔ یہ تعلیم نہ صرف مناسب بلکہ ضروری تھی۔ کیونکہ جیسا کہ بعد کے تجربات نے ثابت کیا اقوامِ غیر سے میل جول کے باعث یہودیوں میں بھی وقتاً فوقتاً بت پرستی اور شرک کے رجحانات عود کر آتے تھے۔ جن کے خلاف اُن کے نبیوں اور پیغمبروں کو متعدّد بار جہاد کرنا پڑا۔ بہر حال یہودیوں کے عقیدہ توحید کی نسلی اساس کا سبب کچھ بھی ہو اس کا عملی اثر یہ ہُوا کہ یہودیوں کے دل و دماغ پر نسلی برتری کا تصوّر پوری شدّت سے چھا گیا اور وہ اُخوّتِ انسانی کے اعلیٰ تر تصوّر سے بیگانہ رہے۔ البتہ جب بابل کے فرمانروا بخت نصر نے ۵۹۷ ق م میں یہودیوں کی سلطنت پر حملہ کر کے ان کے متعدد خاندانوں کو جلاوطن اور بابل میں اسیر کر دیا تو اس اسیری کے دوران میں وہ فاتح قوم کے افراد سے ربط و ضبط پیدا کرنے پر مجبور ہوئے جس کی وجہ سے ان کے مذہبی تخیّل میں کسی قدر وسعت پیدا ہوئی اور وہ پہلی مرتبہ وسیع تر انسانیت کے مفہوم سے روشناس ہوئے اس طرح خالص نسلی خدا کے تصوّر میں اُنہیں قدرے تبدیلی پیدا کرنی پڑی۔ لیکن بحیثیت مجموعی یہودیوں کے عقیدۂ توحید میں اتنی وسعت نہ تھی جتنا اس عقیدہ کا فطری اقتضا ہے۔ دوسرا نقص یہودیوں کے مذہبی تصوّرات میں یہ تھا کہ قانون کی پابندی پر زور دیتے دیتے ان کے قومی مزاج میں ظاہر پسندی اور بے روح ضابطہ پرستی پیدا ہونے لگی۔ اور رفتہ رفتہ اُن کی پوری قوم قانون کی لفظی پیروی کو اجتماعی فلاح اور نجات کا ذریعہ خیال کرنے لگی۔ حالانکہ احترام قانون کا اصل سہارا انسان کا اخلاقی احساس ہے۔ جہاں اخلاقی احساسات کند ہو جائیں۔ وہاں قانون کی ظاہری اطاعت سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ یہودیوں نے اخلاقی احساسات و جذبات کو نشو و نما دینے کے بجائے محض قانون کی جبری قوت پر اعتماد کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اُن میں رسم پرستی، منافقت، ریاکاری اور مذہبی تشدّد کی خصوصیات پیدا ہو گئیں۔ نیز اُن کی اجتماعی زندگی میں مذہبی قانون اور اخلاقی قانون کے مابین کوئی زندہ تعلق نہیں باقی رہا۔ اور وہ اُس حقیقت کو کبھی نہ سمجھ سکے کہ مذہبی قانون کا اصل ماخذ زندگی کا اخلاقی قانون ہے۔

اس لئے محض مذہبی قواعد کی پابندی لایعنی ہے جب تک کہ اخلاق کے بنیادی قوانین کی پابندی بھی اس کے ساتھ نہ جمع کی جائے۔ یہودیوں کی اجتماعی زندگی میں مذہب اور اخلاق کے دائروں کا اس طرح بالکل الگ ہو جانا اس امر کی دلیل تھی کہ اُن کا عقیدۂ توحید مکمل نہ تھا۔ کیونکہ توحیدی تصوّرِ کائنات کا لازمی اقتضا یہ ہے کہ مذہب، قانون اور اخلاق سب کو ایک ہی اصل کی فروع قرار دیا جائے۔ اس کے برعکس یہودیوں نے مذہب کو صرف چند ظاہری قواعد و ضوابط کا مجموعہ سمجھ لیا۔ اور اس کی اخلاقی بنیاد کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

عیسائی عقیدہ۔ عیسائی مذہب یہودیوں کی تنگ نظری، ضابطہ پرستی اور نسلیت کے خلاف ایک طاقتور ردِّ عمل کی صورت میں ظاہر ہُوا۔ اس نے یہودیوں کے عقیدۂ توحید اور تصوّرِ کائنات کی توسیع و اصلاح کی۔ اور ساری انسانیت کو ایک ایسے خُدا کی پرستش پر جمع کرنے کی کوشش کی جو نسلی امتیازات سے بری تھا۔ حضرت عیسیٰ کی تعلیم میں خدا کے متعلق باپ کی جو تمثیل دی گئی ہے۔ اُس کا مطلب یہی تھا کہ جس طرح ایک باپ اپنے سب بچّوں کے شفقت کا یکساں جذبہ رکھتا ہے۔ اسی طرح خدا بھی کل مخلوق کا محافظ۔ نگہبان اور ہدایت دینے والا ہے جس کی نظر میں نسل و قوم کے امتیازات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ عیسائیت نے عقیدۂ توحید میں سے اسرائیلی نسل پرستی کے تمام اثرات زائل کر دیئے اور نوعِ انسانی کو ایک واحد برادری قرار دیا۔ یہ اخوّتِ انسانی کی جانب پہلا حقیقی قدم تھا۔ اس سے پہلے تاریخ میں دُنیا کی مختلف اقوام کو ایک سیاسی مرکز پر جمع ہونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ سلطنتِ روما کے قیام کے بعد مشرق و مغرب کی متعدد اور مختلف اقوام ایک نظمِ سیاسی میں متحد ہو گئیں۔ جس کی وجہ سے اُخوّتِ انسانی کی عیسوی تعلیم کے لئے پہلی مرتبہ فضا سازگار ہوئی۔

دوسری طرف عیسائیت نے قانون کی مبالغہ آمیز پیروی اور ضابطہ پرستی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اخلاقی زندگی کی اہمیّت پر زور دیا اور انسانی ذہن کو اس حقیقت سے روشناس کیا کہ مذہب دراصل اخلاقی قانون کی پیروی کا نام ہے نہ بے روح ضابطہ پرستی کا۔ اس تعلیم کو مؤثر بنانے کے لئے عیسائیت نے حیاتِ اُخروی پر زور دیا۔ یہ عقیدہ یہودیوں میں یا تو موجود ہی نہ تھا یا اتنی ادنیٰ اور رکیک صورت میں پایا جاتا تھا کہ عملی زندگی پر اس کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا تھا۔ حیاتِ اخروی کا عقیدہ اخلاق اور تزکیہ نفس کا قوی ترین محرک ہے۔ کیونکہ اس عقیدہ کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اعمال کے حسن و قبح کا فیصلہ محض ان کے فوری نتائج کی بناء پر نہیں کرتا۔ اور قانونِ اخلاق پر اس وقت بھی عمل پیرا رہتا ہے جبکہ اُس کی پابندی سے کسی مادّی نفع کی توقع نہ ہو۔ یہ عقیدہ بھی یہودیوں کی ضابطہ پرستی اور ظاہری دینداری کا ایک قدرتی ردِّ عمل تھا۔ کیونکہ جو شخص اس بات کا یقین رکھتا ہو کہ انسانی اعمال کے نتائج محض اس دنیوی زندگی تک محدود نہیں رہتے۔ اسے محض چند خارجی رسوم و ضوابط کی پابندی سے اطمینانِ قلب نہیں حاصل ہو سکتا ہے۔ بلکہ اُس کے اندر یہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ مذہبی قوانین کی اصل روح اور ان کے منشاء کے

مطابق عمل کرے تاکہ زندگی کے اخلاقی نصب العین کی حقیقی معنوں میں تکمیل ہو سکے۔ عیسائی مذہب نے یہودیوں کی بڑھتی ہوئی دنیا پرستی اور ظاہرداری کی اصلاح کے لئے اپنے پیروؤں کو اُخروی سعادتوں کے حصول پر ابھار دیا۔ اسی وجہ سے ابتدائی دَور کے عیسائی حیات دنیوی کی عارضی اور اس کے منافع اور لذّتوں کو حقیر جانتے تھے۔ یہ میلان رفتہ رفتہ اتنا بڑھا کہ مذہبی طبقات دنیوی امور سے کنارہ کشی اختیار کرنے لگے اور ان میں رہبانیت، تشقّف اور خانقاہی، زندگی کا شوق و ذوق حدِ اعتدال سے متجاوز ہو گیا۔

اگرچہ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم کا یہ منشا نہ تھا کہ انسان تمدّنی مسائل اور امورِ معاشرت سے بے پرواہ ہو جائے۔ بلکہ حیات اُخروی پر اُنہوں نے اس لئے زور دیا تھا کہ یہودیوں کے اندر اخلاقی جذبات و محرکات کی طاقت پیدا کریں اور لوگ مذہبی قوانین و ضوابط کی لفظی اور ظاہری پیروی کو دین نہ سمجھیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عیسائیت توحیدی مذہب کے ارتقاء کی ایک نئی اور اعلیٰ تر منزل تھی۔ اس نے پہلی مرتبہ قبائلی اور قومی مذہب کی جگہ ایک عالمگیر مذہب کی بنیاد رکھی۔ جس کا دروازہ بلا امتیاز نسل و قوم ہر فرد و بشر کے لئے کھلا ہوا تھا۔ لیکن چند مخصوص داخلی اور خارجی اسباب ایسے پیدا ہو گئے جنہوں نے عیسائی مذہب میں گمراہی اور فساد کے عناصر کی پرورش کی اور اس کے عقیدۂ توحید کو طرح طرح کی خارجی آمیزشوں سے بالکل بدل ڈالا۔ خارجی سببِ فساد یہ ہوا کہ عیسائیوں نے غیر اقوام سے میل جول اور ربط و ضبط پیدا کرنے میں احتیاط نہیں کی۔ یونانی، مصری اور شامی اقوام کے افراد نے بکثرت عیسائی مذہب قبول کیا۔ لیکن دینِ مسیح کے ان نئے پیروؤں کی مذہبی اور دینی تعلیم کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ لوگ تھوڑی بہت ترمیم کے ساتھ پرانے عقیدوں اور خیالات پر قائم رہے اور اپنے نئے مذہبی عقیدہ کی تعبیر و توجیہ کچھ اس اس انداز سے شروع کی۔ جس سے عیسائی تعلیمات اور دیگر مذاہب کی تعلیمات میں بہت کم فرق باقی رہ گیا۔ مثلاً مسیح کی بابت ان کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ انسانی گناہوں کا کفارہ دینے آئے تھے اور مصلوب ہونے کے بعد پھر زندگی حاصل کریں گے۔ یہ متھرائی (MITHRAISM) مذہب کی پیداوار معلوم ہوتا ہے جو ایران میں بہت مقبول تھا۔ اسی طرح تثلیث کے عقیدہ میں جس کا عہد نامہ جدید میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ مصر کے تین بڑے دیوتاؤں ہورس (HORUS) سیریپس (SERAPIS) اور آئسس (ISIS) کے اعتقاد کی جھلک نظر آتی ہے۔

اس کے علاوہ عیسائی عقائد میں افلاطونی نظریات کی بھی آمیزش ہو گئی۔ مجلس نیقیہ (COUNCIL OF NICEA) میں قسطنطین اعظم کے زیرِ صدارت اثاثانیوس (ATHANASIUS) اور آریوس (ARIUS) کے مابین جو مباحثے ہوئے تھے اور اُن میں فلسفیہ اور نو افلاطونی تصوّرات کا جس کثرت کے ساتھ استعمال کیا گیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیوں پر اسکندریہ کے مکاتیب فلسفہ کا بڑا زبردست اثر پڑا تھا۔ اس خارجی سببِ فساد کے علاوہ ایک داخلی سبب یہ ہوا کہ حضرت عیسیٰؑ اپنے مختصر دَورِ رسالت میں عیسائی نظامِ فکر کو پورے طور سے مرتب نہیں کر سکے اور ان کی تعلیمات

میں بہت سے خلا باقی رہ گئے۔ جن کو بعد کے لوگوں نے غلط طریقہ سے پُر کیا نتیجہ یہ ہُوا کہ عیسائی عقیدۂ توحید نامکمل رہ گیا اور آنے والے دور میں انسانی فکر و عمل کے تقاضوں کا کفیل نہ ہوسکا۔ پہلے تو عیسائی مذہب نے انسان کی مذہبی اور سیاسی زندگی کے درمیان ایک ایسا خطِ تفریق کھینچ دیا جس سے زندگی کی وحدت باطل ہوگئی۔ پھر چونکہ عیسائیت یہودیوں کی ضابطہ پرستی اور قانونیت کا ردِّ عمل تھی اور انسان کو اس کے روحانی اور اخلاقی سرچشمۂ اعمال کی طرف متوجہ کرنا چاہتی تھی اس لئے اس نے قانون اور سیاست سے متعلقہ امور کو کوئی وزن نہیں دیا۔ اور ان کے بارے میں کامل سکوت اختیار کیا۔ مسیح نے اپنی زندگی میں یہ اعلان کیا تھا کہ میری بادشاہت اس دنیا کی نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ سمجھا گیا کہ خالص سیاسی اور دنیوی امور سے مذہب کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اسی طرح حضرت عیسٰی نے سیاسی اطاعت اور مذہبی اطاعت کے دائرے الگ کر دیئے اور اپنے پیروؤں کو یہ تعلیم دی کہ جو کچھ خدا کا ہے وہ خدا کو دو اور جو کچھ قیصر کا ہے وہ قیصر کو جس کے معنی یہ ہیں کہ اخلاقی زندگی کی حدیں سیاسی زندگی کے حدود سے بالکل الگ ہیں! اخلاق و روحانیت کو سیاسی اور دنیوی امور سے جدا کرنے کا نتیجہ یہ ہُوا کہ جب عیسائیت رومی شہنشاہوں کے مظالم اور سخت گیریوں کے باوجود سلطنت میں ایک منظم طاقت بن گئی اور حکومت و اقتدار اس کی دسترس میں آگیا۔ اس وقت بھی اس نے سلطنت پر قبضہ کرنے اور اس کے حاکمانہ اختیارات کو روحانی اغراض و مقاصد کے لئے استعمال کرنے کا ارادہ نہیں کیا۔ اس کے باوجود چونکہ عیسائی کلیسا ایک نہایت منظم ادارہ بن گیا تھا اور عوام کی ساری طاقت اس کے پسِ پُشت تھی، اس لئے سلطنت پر اس کا اثر پڑنا ضروری تھا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ عیسائی کلیسا سلطنت کے اندر ایک سلطنت بن گیا۔ کلیسائی اقتدار اور شہنشاہی اقتدار کے مابین شدید کش مکش شروع ہوگئی جو مغربی عیسائیت کی تاریخ میں عرصہ دراز تک جاری رہی۔ اس تصادم میں مذہب کا کوئی فائدہ نہیں ہُوا۔ بلکہ اُلٹا نقصان یہ ہُوا کہ دنیوی اقتدار سے مقابلہ کرتے کرتے مذہبی طبقات اپنے اخلاقی فرائض سے غافل ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ بالآخر ان کے خلاف سمجھدار اور باشعور طبقوں میں ایک شدید جذبۂ نفرت پیدا ہوگیا اور شمال مغربی یورپ کی عیسائی اقوام نے ایک ایک کرکے رومی کلیسا سے اپنا تعلق منقطع کرنا شروع کیا۔ جو سیاست اور مذہب کی کامل جدائی کے مترادف تھا۔

درحقیقت عیسائیت نے انسان کے سیاسی مسائل کا کوئی حل نہیں پیش کیا بلکہ سیاست کی سرحدیں اخلاق کی سرحدوں سے الگ کر دیں۔ جس کے نتائج بہت خراب ہوئے۔ زندگی کے مادی اقدار کی تحقیر میں بیجا غلو سے کام لینے کے باعث دینِ عیسوی نے بالواسطہ رہبانیت، تقشف اور خانقاہی زندگی کی حوصلہ افزائی کی جس طرح یہودی مذہب نے آخرت کے تصوّر کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی اور اس نقص کی وجہ سے یہودیوں میں دنیاداری، ظاہر پرستی اور قانون کی لفظی پیروی کا روگ پیدا ہوگیا تھا۔ اسی طرح عیسائیت نے آخرت کے تصوّر پر اتنا غیر متوازن زور دیا۔ کہ اس کے پیرو دنیوی امور اور مادی ضروریات کی طرف سے غافل ہوگئے بلکہ ان باتوں کی طرف توجہ کرنے کو خدا پرستی کے خلاف

سمجھنے لگے۔ عیسائیوں میں یہ عقیدہ کبھی مقبول نہ ہو سکا کہ اعتدال، میانہ روی اور انصاف پسندی کے ساتھ دنیوی امور کی سرانجام دہی اُخروی زندگی کی سعادت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے۔ وہ آخرت اور دنیا کو دو متضاد حقیقتیں سمجھنے لگے گویا دنیوی امور میں مشغولیت نجات اخروی کے لئے نقصان رساں ہے اور جو انسان اپنی آخرت کو سنوارنا چاہے اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ دنیوی ضروریات اور زندگی کے مادی تقاضوں کا کچھ خیال نہ کرے۔ اس طرح عیسائی عقیدۂ توحید بھی مادہ اور روح، دنیا اور آخرت، سیاست اور اخلاق کے تضاد کو رفع نہ کر سکا۔ اس لحاظ سے وہ نامکمل تھا اور انسان کی بڑھتی ہوئی تمدنی ضروریات کا کفیل نہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ عقیدۂ توحید میں ابھی مزید اصلاح و توسیع کی ضرورت تھی۔ تاکہ وہ انسان کو ارتقاءِ عقل اور ترقیِ اخلاق کی نئی منزلوں تک پہنچا سکے۔ یہ کام اسلام نے آکر سرانجام دیا۔

اسلامی عقیدہ۔ اسلام کے عقیدۂ توحید کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ اس نے یہودی اور نصرانی عقائد کے غلو کو مٹا کر زندگی کی تمام جزوی حقیقتوں کو مربوط کیا اور اس طرح ایک مکمل مگر واحد نظام فکر کی تشکیل کی جس میں حقیقت کے ہر پہلو کو اس کا صحیح مقام دیا گیا اور کسی پر اتنا غیر متوازن زور نہیں دیا گیا کہ مخالف پہلو کی بالکل نفی ہو جائے یا اس کی اہمیت میں کوئی کمی واقع ہو۔ اسلامی عقیدۂ توحید کا یہ مکمل توازن اور اس کے اجزا کا باہمی ربط و تعلق نیز ان کا ایک واحد اصل سے مستنبط کیا جانا، جس طرح درخت کی مختلف شاخیں ایک جڑ سے پھوٹتی ہیں یا ایک عضویہ کے مختلف اعضاء و جوارح میں کامل ارتباط اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے اس کو دیگر تمام توحیدی عقائد سے ممتاز کرنے کے لئے کافی ہے۔ مثلاً اسلام نے عیسائی مذہب کی عالمگیریت کو قائم رکھا۔ مگر نسل و خون کے رشتوں کا بالکل انکار نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلام نے عربی قوم کو نسلِ انسانی کی اصلاح کا ذریعہ بنایا تھا۔ اس لئے وہ قومیت اور نسل و خاندان کی نفی اتنی شدت سے نہیں کر سکتا تھا جتنی عیسائیت نے کی تھی۔ کیونکہ عیسائی مذہب نے دنیا کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے کسی قومی گروہ کو منظم کرنا ضروری نہیں خیال کیا۔ ساتھ ہی ساتھ اسلام نے عربی قومیت کے تخیل کو اتنی اہمیت بھی نہیں دی جس سے اس کی عالمگیریت فنا ہو جاتی یا اسلامی برادری اور عربی قومیت میں کوئی فرق نہ باقی رہ جاتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاندان، قبیلہ اور نسل و قوم کے رشتوں کو جائز حد تک اہمیت دی اور اپنے عمل سے ثابت کیا کہ خون اور قوم کے رشتے بشرطیکہ وہ مذہبی عقائد کی یکسانیت کو نہ مجروح کریں بالکل نظرانداز کر دینے کے قابل نہیں ہیں۔ مدینہ میں ہجرت کے بعد آپ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات کا جو رشتہ قائم فرمایا تھا بعد میں اس کو منسوخ کر دیا تاکہ اسلام کے دائرہ میں خونی رشتوں کی اہمیت کو باقی رکھا جا سکے۔ اسی طرح آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے خونی رشتہ داروں سے جو محبت تھی اُس کے اظہار میں آپ نے کبھی تامل نہ فرمایا۔ مثلاً بدر کی لڑائی کے بعد جب حضرت عباس قید ہو کر آئے تو اُن کی تکلیف سے آنحضرتؐ بہت متاثر ہوئے اور آپ نے مسلمانوں

کی اجازت سے اُن کی بیڑیاں کٹوا دیں۔

حضرت مسیح کا طرزِ عمل اپنے قریبی اعزہ اور رشتہ داروں سے بہت مختلف تھا اور آپ نے خاندانی اور خونی علائق کو کبھی اہمیت نہیں دی۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ جب آپ کی والدہ آپ سے ملنے کے لئے آئیں تو آپ اُن کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ خاندانی تعلقات کی اہمیت کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبائلی جذبات کی اہمیّت کو بھی خوب سمجھتے تھے۔ چنانچہ الائمۃ من القریش کی حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ جائز حدود کے اندر قبائلی اثرات کو تسلیم کرتے تھے۔ قومی، نسلی اور خونی رشتوں کی اہمیت پر عیسائی مذہب نے اس لئے توجہ نہیں کی کہ سیاسی سطح پر اسے وقت کی طاقتوں کا مقابلہ کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

اس کے برخلاف اسلام کو ابتدا ہی سے عرب کی سیاست میں حصّہ لینا پڑا۔ اس لئے وہ خاندانی قومی اور نسلی احساسات کی اہمیت کو یکسر نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ چونکہ اس کا مشن عالمگیر تھا اور وہ محض عربی قوم کی فلاح و بہبود نہیں بلکہ کل انسانیت کی فلاح کا مقصد لے کر آگے بڑھا تھا۔ اس لئے اس نے قومی، نسلی اور قبائلی عصبیت کو اعتدال پر لانے کی پُر زور جدوجہد کی تاکہ وہ ایک وسیع تر روحانی معاشرہ کے ذیلی عنصر کی حیثیت اختیار کر لے۔

قرآن حکیم نے اس مسئلہ کی بابت یہ نقطۂ نظر اختیار کیا کہ شعوب و قبائل اور قوموں اور نسلوں کا وجود محض شناخت کی آسانی کے لئے ہے۔ لیکن اُن کی بناء پر انسانوں کے درمیان کسی فرق مراتب کو روا رکھنا جائز نہیں ہے:

یاایھا الناس انا جعلنا کم شعوباً و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللّٰہ اتقکم۔	اے لوگو ہم نے تمہیں شعوب اور قبائل کی صورت میں اس لئے پیدا کیا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو لیکن تم میں سے خدا کے نزدیک عزت والا وہی ہے جو سب سے زیادہ خدا ترس ہو۔

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ آج سے عرب کو عجم پر اور عجم کو عرب پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ اس طرح اسلام نے یہودیت اور نصرانیت دونوں کے اجزائے ترکیبی رہنے دیئے۔ مگر اُن کی اضافی اہمیّت کو واضح کر دیا تاکہ ان میں بے اعتدالی نہ پیدا ہو سکے۔ یہی چیز ہمیں قانون اور اخلاق کے دائروں میں بھی نظر آتی ہے۔ جہاں یہودیوں اور عیسائیوں نے دو متضاد راہیں اختیار کی تھیں۔ حضرت مسیح نے زندگی کے اخلاقی پہلو کو بجا طور پر اہمیّت دی تھی مگر ایک منظم معاشرتی زندگی کے لئے صرف روحانی جذبات اور اخلاقی احساسات کا وجود نا کافی ہے بلکہ ملکی، سیاسی اور معاشرتی قوانین کا نفاذ بھی ضروری ہے۔ کوئی معاشرہ انسان کی اخلاقی فضیلت پر اتنا اعتماد نہیں کر سکتا کہ وہ قوانین کی مدد سے بالکل مستغنی ہو جائے اور سیاسی جبر کے استعمال کو غیر ضروری قرار دے۔ ممکن ہے کہ انسانی تاریخ میں ارتقائے اخلاق کی کوئی ایسی منزل بھی آئے جب کہ جمہور کو راست روی اور معاشرتی عدل پر قائم رکھنے کے لئے کسی قانونی جبر یا سیاسی دباؤ کی ضرورت مطلقاً نہ پیش آئے اور بلاشبہ مذہب اخلاق کا منتہائے نظر بھی یہی ہے کہ انسان فضیلت اخلاقی کے ایسے

بلند درجہ پر پہنچ جائے جہاں کسی خارجی قوت کے استعمال بغیر وہ اپنے آزاد اختیار سے معاشرتی عدل قائم رکھ سکے۔

لیکن بہرحال جب تک انسان میں بشری کمزوریاں موجود ہیں اور اس کے اخلاقی احساسات میں ضعف پایا جاتا ہے اس وقت تک ارتکاب جرائم کو روکنے کے لئے حکومت اور قانون کی ضرورت باقی رہے گی۔ اس لئے عیسائیت نے قانون کی طرف سے جو تغافل برتا تھا وہ اخلاقی حیثیت سے جائز نہیں تھا۔ اسلام نے اس کمی کی تلافی کر دی اور یہودی مذہب کے قانونی عنصر کو قائم رکھا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس نے عیسائیت کے اس نظریہ کی تائید کی کہ قانون اور حکومت معاشرتی فلاح کا تنہا سہارا نہیں ہے بلکہ انسان کا اخلاقی کردار اور اس کی روحانی فضیلت قانون کی بہ نسبت زیادہ اہم ہے۔ اس طرح اسلام نے یہودی مذہب کی قانونیت اور عیسائیت کی اخلاقی اسپرٹ کا ایسا خوشگوار امتزاج پیش کیا جس میں انسانی زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کو مناسب اہمیت دی گئی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ ایک طرف اسلام نے حضرت امام ابو حنیفہ جیسے ائمہ مجتہدین اور فقیہ پیدا کئے اور دوسری طرف شبلیؒ جنیدؒ اور بایزید بسطامیؒ جیسے صوفیا جنہوں نے تزکیہ نفس اور طہارتِ اخلاق کے اعلیٰ ترین نمونے پیش کئے۔ مسلمانوں میں یونانیوں کی فکری صلاحیتیں، رومیوں کی ملک گیری اور سیاست دانی، یہودیوں کا احترام قانون اور عیسائیوں کے اخلاقی فضائل یکجا اور متحد تھے۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ اسلام نے یہودیت اور نصرانیت کے متضاد عناصر کو اس طرح جمع کیا کہ ان کے درمیان کوئی تعارض باقی نہیں رہا۔ اور ہر عنصر کو اس کا صحیح مقام اور جائز اہمیت حاصل ہوگئی۔ نیز اس غلو اور شدت کا دروازہ بند ہوگیا جس کا ارتکاب کر کے یہودیوں اور عیسائیوں نے مذہب کو سخت ترین نقصان پہنچایا تھا۔ اسی بے اعتدالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے اپنے پیروؤں کو تاکید کی کہ دین میں غلو نہ کرو ولا تغلوا فی دینکم۔

عقیدۂ آخرت کے متعلق بھی اسلام نے ایک ایسا نظریہ پیش کیا جو یہودیت اور نصرانیت دونوں کے نقائص سے بری تھا۔ یہودیوں میں جیسا کہ بتایا جا چکا ہے اس عقیدہ کا اثر بہت کمزور تھا وہ اعمال کے دنیوی اور ظاہری نتائج سے زیادہ متاثر ہوتے تھے اور خدا کے قانونِ جزا و سزا کو صرف اپنی قومی تاریخ کے واقعات پر پرکھتے تھے۔ اس لئے ان میں اخلاقی فضیلت کی کمی رہی۔ کیونکہ انسانی اعمال میں فضیلت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب دنیوی نفع کی خواہش یا مادی نقصان کا خوف اس کے افعال کا محرک نہ ہو۔ یوں تو اجتماعی زندگی میں نیکی کی طرف میلان اس اعتقاد سے بھی پیدا کیا جا سکتا ہے کہ نیکی اور حسنِ اخلاق بالآخر ہماری معاشرتی بہبود کے لئے ضروری ہے لیکن اخلاق کے اعلیٰ ترین درجات وہ ہیں جہاں انسان نتائجِ دنیوی سے بے پرواہ ہو کر قانونِ اخلاق کی پیروی محض اس لئے کرے کہ اس کا یہ عمل رضائے الٰہی کا موجب ہوگا۔ عیسائیت نے اخلاق کے اس آخرالذکر محرک پر اپنی تعلیمات کا دارومدار رکھا اور اول الذکر کی قدر و قیمت کا مطلق خیال نہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائیوں نے دنیا اور اس کے مسائل سے بے توجہی برتنی شروع کی اور ان میں عقبیٰ کے

متعلق یہ غلط تصور پیدا ہو گیا کہ وہ ہماری اس مادی دنیا کی ضد ہے۔ اس طرزِ فکر کا اثر یہ ہوا کہ عیسائیوں نے امورِ دنیا میں مشغولیت کو نجاتِ اُخروی کے حق میں خطرناک قرار دیا اور ترک دنیا کی طرف انہیں روز بروز رغبت ہونے لگی۔ اسلام نے عیسائیوں کے اس عقیدہ کی اصلاح کے لئے اس امر پر زور دیا کہ دنیوی اور مادی لذات بشرطیکہ وہ جائز حدود کے اندر ہوں، روحانیت کی ضد نہیں ہیں اور اُخروی زندگی حیاتِ دنیوی کا تسلسل ہے۔ جو شخص مادی زندگی سے بالکل الگ ہو کر خالی عبادت و ریاضت سے نجاتِ اُخروی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی عاقبت کو خراب کرتا ہے۔ کیونکہ اسلام کی نظر میں عالم بالکل بے حقیقت نہیں ہے۔ بلکہ وہ آنے والی زندگی کا ابتدائی مرحلہ ہے۔ جس میں سے گذرنا انسان کی روحانی ترقی کے لئے ضروری اور لابدی ہے۔ آخرت کا اسلامی تصور یہ ہے کہ وہ حیاتِ دنیوی کی ایک اعلیٰ منزل ہے۔ جس کا حصول اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ نچلی منزل کی کیفیات اور ضروریات سے انسان آشنا ہو۔ ہماری مادی زندگی ایک ٹھوس حقیقت ہے وہم و خیال نہیں۔ البتہ آخرت کے مقابلہ میں یہ ایک ادنیٰ شے ہے:

بل تؤثرون الحیوۃ الدنیا و الآخرۃ خیرٌ و ابقیٰ۔ — تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت اس سے بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔

یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ حیاتِ دنیا خیر نہیں بلکہ زور اس پر دیا گیا ہے کہ اس کے مقابلہ میں آخرت ایک بہتر اور زیادہ باقی رہنے والی زندگی ہے۔ یہی نقطۂ نظر اسلام نے رہبانیت اور تقشف کے بارے میں اختیار کیا۔ یعنی زندگی کی آرائشوں اور زینتوں کی نفی نہیں کی بلکہ اپنے پیروؤں کو اُن سے لطف اندوز ہونے کی ترغیب دی۔ عیسائیوں میں ترکِ لذت کا جو میلان پیدا ہو گیا تھا اُسے دور کرنے کے لئے قرآن نے اعلان کیا کہ دنیا کی زینتوں کو حرام کر لینا دینداری نہیں:

قل من حرّم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہٖ والطیبات من الرزق۔ — کہو کہ اللہ کی زینتوں اور پاک اشیاء رزق کو جو اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی ہیں کس نے حرام قرار دیا۔

ساتھ ہی قرآن نے مسلمانوں کو

کلوا واشربوا ولا تسرفوا۔ — (کھاؤ، پیو مگر حد سے زیادہ نہ بڑھو۔)

کی تعلیم دی۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ زندگی کی مادی حاجات کا پورا کرنا عین مقتضائے دینداری ہے۔ البتہ ان میں ضرورت سے زیادہ انہماک اچھا نہیں۔ اسی طرح آخرت پر زور دینے کے باوجود اسلام نے اعمالِ حسنہ کے دنیوی نتائج کی اہمیت بھی تسلیم کی۔ مثلاً قرآن نے مسلمانوں کو

وعد اللہ الذین امنوا و عملوا الصلحت لیستخلفنھم فی الارض۔ — (اللہ نے ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں زمین کی خلافت عطا فرمائے گا۔)

کا مژدہ سُنایا اور اعمالِ بد کے قدرتی نتائج سے متنبہ کرنے کے لئے عاد و ثمود اور دیگر اقوام قدیم کی تاریخ سے استشہاد کیا اور ان کی تباہی اور بربادی کا بار بار ذکر کیا اس طرح اس نے نتائجِ اعمال کے ہر دو پہلوؤں کی وضاحت کی اور نیکی کی ترغیب کے لئے صرف آخرت کے تصوّر کو کافی نہیں سمجھا بلکہ خیر و شر کی معاشرتی اور تمدّنی معنویت کو نمایاں کیا۔

غرضیکہ اسلام نے یہودیت اور نصرانیت کے عناصر کو نہایت کامیابی سے ترکیب دے کر ایک ایسا جامع نظام مرتب کیا جس میں زندگی کے متضاد پہلوؤں کی یکساں رعایت رکھی گئی ہے۔ یہودی اور عیسائی تعلیمات میں اس طرح مطابقت پیدا کرنے کے بعد اسلام نے اپنے عقیدۂ توحید کو عملی زندگی پر منطبق کر دکھایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جو جامعیت پائی جاتی ہے وہ اس عقیدہ کا شخصی اور عملی مظہر ہے۔ حضور رسالتمآبؐ پبلک زندگی میں قوم کے پیغمبر، مصلح، حکمران، فاتح اور مقنن اور شخصی زندگی میں ایک شفیق باپ اور مہربان شوہر تھے۔ زندگی کی مختلف کیفیات اور متضاد قوتیں آپ کی ذات میں بصورتِ وحدت جلوہ گر تھیں۔ بالکل اسی طرح اسلام نے اجتماعی زندگی کے مختلف دائروں کو ایک واحد نقطہ پر سمیٹ لیا۔ اور تمدّن کے مختلف شعبوں کے مابین جتنے حدود فاصل تھے ان سب کو ایک ایک کر کے مٹا دیا۔ اس نے ایک طرف سیاست اور اخلاق، مذہب اور حکومت کے تناقض کو رفع کیا۔ دوسری طرف دنیاداروں اور دینداروں کے امتیازی طبقات کا خاتمہ کیا۔ پھر عبادت کا تصوّر اتنا وسیع کیا کہ نہ صرف خالص مذہبی اعمال بلکہ تمدّن و معاشرت کی تمام سرگرمیاں اس کی تعریف میں داخل ہو گئیں۔ اسلام سے پہلے حکومت الگ چیز تھی اور مذہب الگ تھا۔ مذہبی لوگوں کو حکومت سے بالعموم کوئی واسطہ نہ ہوتا تھا بلکہ وہ اکثر اوقات حکومت اور اس کے تمام کاموں سے متنفر اور حاکمانہ اختیارات کے استعمال کو منافیِ مذہب تصوّر کرتے تھے۔ اسلام ہی نے آکر یہ تخیّل پیش کیا کہ مذہب اور حکومت میں کسی قسم کا تضاد نہیں۔ اور نہ حکومت اور سیاست کے فرائض کسی خاص طبقہ سے متعلق ہیں۔ بلکہ ہر وہ شخص جو قانونِ اسلام کا اطاعت گزار اور عقل و خرد سے بہرہ ور ہو، امورِ سلطنت اور نظم و نسق کی رہبری کر سکتا ہے۔ عیسائیت کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ اس نے مذہبی سرگرمیاں کو معاشرت اور اخلاق کے دائرہ میں محدود کر دیا تھا۔ اور حکومت کو اصولِ مذہب اور قوانینِ اخلاق پر چلانے اور قائم رکھنے کے لئے کوئی تدبیر نہیں اختیار کی تھی۔ سیاست و اخلاق اور حکومت و مذہب کی یہ جُدائی عقیدۂ توحید کے منافی تھی جس کی رُو سے زندگی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ اسلام نے اس دوئی کو مٹا کر سیاست کو اخلاق کا تابع اور حکومت کو مذہب کا خادم بنا دیا۔ اسی وجہ سے خلافتِ راشدہ کے دَور میں مسلمانوں کی دنیوی امامت اور دینی رہبری ایک شخص کے ہاتھ میں تھی۔ خلفائے راشدین بہ یک وقت مسلمانوں کے دنیوی امام اور دینی پیشوا تھے۔ اسلام کے عقیدۂ توحید کا عملی اقتضا بھی یہی تھا۔ کہ دینی اور دنیوی امور کی سربراہی ایک ہی جماعت کے ہاتھ میں رہے۔ تاکہ مذہبی اور غیر مذہبی طبقات کی غیر فطری تقسیم کا یک لخت خاتمہ ہو جائے۔ اسلام سے پہلے ہر مذہب نے

دنیاداروں اور دینداروں کے گروہ الگ الگ بنا رکھے تھے۔ مذہب کی تعلیمات و احکام سے صرف ایک محدود اور مختصر طبقہ واقف ہوتا تھا۔ افرادِ معاشرہ کی ایک بڑی اکثریت دینی امور میں اس طبقہ کی بے چون و چرا پیروی کرتی تھی۔ زمانۂ قدیم میں یہی مذہبی طبقات علم اور تعلیم کے بھی اجارہ دار ہوتے تھے۔ علوم و فنون کے جتنے شعبے اس زمانہ تک ایجاد ہوئے تھے اُن پر مندروں کے پجاریوں اور کلیسا کے پادریوں کا قبضہ تھا۔ جنہوں نے علم و فن کو ایک راز سربستہ بنالیا تھا اور غیر مذہبی طبقہ کے افراد کو ان تمام امور سے بے بہرہ رکھا جاتا تھا۔ اس طرزِ عمل کے باعث علم کی اشاعت محدود ہوگئی اور عوام الناس تو کیا خواص پر بھی تعلیم کا دروازہ بند ہوگیا۔ جس کا اثر یہ ہؤا کہ لوگ جہالت، توہم پرستی، تقلید اور آبا پرستی میں گرفتار اور آزادانہ غور و فکر کی صلاحیت سے محروم ہوگئے۔

اسلام نے اس اجارہ داری کا خاتمہ کرکے بلا امتیاز ہر طبقہ کے افراد کو فہم و تدبّر اور حصولِ علم کی دعوت دی اور مذہبی طبقات کو جو خصوصیت حاصل تھی اس سے انھیں محروم کردیا۔ اس طریقِ کار کی بدولت مسلمانوں کے ہر طبقہ میں علم کا ذوق و شوق پیدا ہؤا اور تقلید کی بندشوں سے آزاد ہوکر اُنہوں نے مظاہر فطرت اور مسائل تمدّن پر بے باکی سے غور و فکر کرنا شروع کیا۔ اسلام کے ابتدائی دَور میں نہ پجاریوں کا کوئی طبقہ تھا نہ پادریوں اور مذہبی پیشواؤں کا۔ ہر مسلمان قرآن و سنت کی ہدایت کے ماتحت اپنے اعتقاد و ضمیر اور عمل میں بالکلیہ آزاد تھا۔ پیروں، مشائخوں اور مذہبی پیشواؤں کی جو کثرت زمانۂ مابعد میں پائی جاتی ہے اس سے صدرِ اوّل کے مسلمان قطعاً ناآشنا تھے۔ کیونکہ اسلام نے عقیدۂ توحید کا عملی زندگی پر اطلاق کرکے اِن تمام امتیازی علامات اور خصوصی حقوق کا خاتمہ کردیا جس پر طبقاتی تقسیم مبنی تھی۔ آج بھی جبکہ مسلمانوں میں بہت سی غیر اسلامی باتیں پیدا ہوگئی ہیں ان میں دینداروں اور دنیاداروں کی تقسیم اور مذہبی اور غیر مذہبی طبقات کا فرق بہت کم پایا جاتا ہے۔ یہ عدم طبقاتیت اور دین و دنیا کی یکجائی نہ ہمیں عیسائیت میں ملتی ہے نہ یہودیت میں اور نہ کسی دوسرے قدیم مذہب میں۔ کیونکہ یہ تنہا مذہب اسلام کی خصوصیت ہے۔

افکارِ ابنِ خلدون

مصنّفہ محمد حنیف ندوی

قیمت تین روپے آٹھ آنے

تہذیب و تمدّنِ اسلامی

مصنّفہ رشید اختر ندوی

قیمت حصّہ اوّل پانچ روپے۔ دوم چھ روپے ۸ر سوم پانچ روپے ۱۲ر

مینجر ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور